© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

اسلام میں جوازِ اجتہاد کی ایک مشہور دلیل حضرت معاذ بن جبل کی وہ روایت ہے جس میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا گورنر بنا کر اُن کو روانہ کیا تو آپؐ نے اُن سے پوچھا "تم معاملات کا فیصلہ کس طرح کروگے؟ عرض کیا" کتاب اللہ سے " پھر سوال ہوا " اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں تم کو نہ ملے تو! عرض کیا " اب سنتِ رسول اللہ کی روشنی میں!" اب ارشاد ہوا " لیکن اگر سنتِ رسولؐ میں بھی تم کو اُس کا ذکر نہ نظر آئے! جواباً گذارش ہوئی،" تو اب میں اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا" حضور پُرنورؐ کو یہ سُن کر بڑی مسرت ہوئی اور فرمایا "جمیع حمد ثابت ہے اُس ذاتِ بابرکات کے لئے جس نے اپنے بندہ (معاذ) کو اپنی مرضی پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی۔"

" اپنی رائے " سے کام لینا درحقیقت یہی اجتہاد ہے۔ اگر یہ اجتہاد کسی امر شرعی سے متعلق ہو، اور اُن حدود کے اندر ہو جو شارع نے مقرر کردیئے ہیں تو اس " اپنی رائے سے کام لینے " کو اجتہادِ شرعی کہتے ہیں۔ ایک ایسا دین جو کامل و مکمل ہو، جس کا پیغمبر ختم الرسل اور جس کی کتاب الٰہی آخری کتاب ہو، ہر زمانہ اور ہر ماحول اور تاریخِ عالم کے ہر دور میں اُس وقت تک قابلِ عمل ہرگز ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اُس میں اجتہاد کا میدان وسیع نہ ہو، چنانچہ نبوت کے ختم ہو جانے اور نزولِ وحی کے ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جانے کی مکافات اور تلافی اسی اجتہاد کو مشروع کر کے کی گئی ہے۔ رہا اختلاف و انشقاق! تو یہ انسان کی فطرت میں رچا بسا ہے، جب تک انسان، انسان ہے، خواہ وہ کیسا ہی فرشتہ خصلت اور ملائک جناب ہو، اختلاف ناگزیر ہے، اس بنا پر کوئی مجتہد کتنا ہی عظیم المرتبت اور کیسا ہی صائب الرائے ہو اختلاف سے نہیں بچ سکتا اور جب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختلاف سے نہیں بچ سکتا تو مخالفت اور اُس کے لوازم سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اختلاف یا مخالفت کس درجہ کی ہے؟ اس کا دار و مدار مجتہد کی شخصیت پر ہے۔ لوگوں نے مخالفت حضرت عمرؓ کے اجتہادات کی بھی کی، لیکن فاروقی عظمت و دبدبہ کے سامنے یہ آوازیں اُٹھ اُٹھ کے دب کے رہ گئیں، لیکن عہدِ عثمانی میں جب مخالفت کی ہوانے شر و فساد کی آگ بھڑکادی تو انجام یہ ہوا کہ اسے بجھانے کے لئے خلیفۂ وقت کو اپنے مقدس خون کے چھینٹے پیش کرنے پڑے!!

مذکورۂ بالا روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رائے کے استعمال کی اجازت صرف انہیں مسائل میں ہے جن کا ذکر قرآن و سنّت میں نہ ہو، لیکن ہم دیکھتے ہیں ائمۂ مجتہدین نے رائے کا استعمال اُن مسائل میں بھی کیا ہے جن کا ذکر قرآن و حدیث میں موجود ہے، تو اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ جائز ہے؟ اور کیا اس کو اجتہادِ شرعی کہا جائے گا؟ جواب یہ ہے کہ "وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ؕ" کے ارشادِ گرامی کے مطابق اللہ اور اُس کے رسول کے حکم کے بعد کسی شخص کو کسی قسم کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ تو پھر خلفائے راشدین کی نسبت یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کسی بھی معاملہ میں اللہ اور رسول کے حکم کے خلاف کوئی فیصلہ دیا ہے، لیکن خدا اور رسول کا حکم ہے کیا؟ اور اُس کا مطلب کیا ہے؟ اگر وہ ظاہر یا نص ہے تو عام ہے یا خاص؟ اگر عام ہے تو مخصوص البعض ہے یا نہیں اور اگر خاص ہے تو معلل ہے یا غیر معلل، اگر معلل ہے تو اُس کی علت کیا ہے؟ پھر وہ علتِ تامہ ہے یا ناقصہ! یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب کہ مجتہد کو تحقیقِ مناط، تخریجِ مناط، اور تنقیحِ مناط کی وادیوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ پھر وہ حکم اگر خفی یا مجمل ہے تو اب اس کی تشریح ضروری ہے۔ غرض کہ اللہ اور رسول کا حکم صرف وہ نہیں ہے جو قرآن کی کسی آیت یا کسی حدیثِ نبوی کے منطوق یا اُس کی عبارت سے متبادر ہوتا ہے، بلکہ صحابۂ کرام عموماً اور خلفائے راشدین خصوصاً اُن کا مستمر عمل اور کسی امر میں اُن کا کوئی قطعی فیصلہ خود اللہ اور رسول کے حکم کی نشاندہی کرنے کے لئے کافی ہے کیونکہ قرآن مجید کے اول مخاطب، مدرسۂ نبوت و رسالت کے بلا واسطہ تربیت یافتہ و فیض پذیرفتہ یہی حضرات تھے اُن سے زیادہ کوئی شخص اس حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا کہ کس آیت اور کس ارشادِ نبوی کا کیا مطلب ہے؟ اُس سے غرض و غایت اور منشا و مقصد کیا ہے؟ سببِ نزول اور اساسِ حکم کیا ہے؟ اس بناء پر خلفائے راشدین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا کوئی عمل یا حکم تو درحقیقت اللہ اور رسولؐ کے ارشاد (اگر حکم قرآن و سنت میں موجود ہو) کے اصل مطلب کی تعیین و تشخیص کرنا ہے، نہ کہ اُس کا رَد! اگر دونوں میں تضاد نظر آتا ہے تو یہ صرف ہماری سمجھ کا پھیر اور اصل نص کے حقیقی مفہوم و مصداق سے بربنائے عجز، دنارسی، عدم واقفیت کی دلیل ہے، اس بناء پر یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن و سنت میں کسی حکم کے ہوتے سہاتے صحابۂ کرام اپنی رائے اور اپنے اجتہاد سے کام لیتے اور قرآن و سنت کے حکم کو نظر انداز کر دیتے تھے، معاذ اللہ! اس کی جرأت تو کوئی ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی نہیں کر سکتا۔ پھر صحابہ ایسا کیونکر کر سکتے تھے!

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اگر عیینہ بن حصن الفزاری اور عباس بن مرداس السلمی کو بحیثیت مولفۃ القلوب کے صدقات میں سے حصہ دینے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کو اسی مد میں اتنا دیتے تھے کہ ایک مرتبہ غزوۂ احزاب میں انصار کو آپؐ سے شکایت پیدا ہو گئی تھی، یا اگر ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے دو غلاموں پر چوری کرنے کے الزام میں ماخوذ ہونے کے باوجود حدِ سرقہ جاری نہیں کی تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ثانی خلیفۂ راشد نے قرآن کو نظر انداز کر دیا۔ بلکہ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ فاروقِ اعظمؓ کے "علم" میں (رائے میں نہیں) قرآن مجید میں مصارفِ صدقات میں مولفۃ القلوب کا ذکر موقت تھا نہ کہ مطلق یعنی صرف اُس زمانہ تک کے لئے یہ حکم تھا جبکہ اسلام کمزور تھا، اسی طرح قرآن میں حدِ سرقہ کا جو ذکر ہے تو حضرت عمرؓ اس کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ سرقہ موجبِ حد اُس وقت ہوتا ہے جب کہ اُس کا ارتکاب بلا ضرورت اور محض بربنائے خباثتِ طبع کیا جائے، ورنہ حالتِ اضطرار میں اکلِ میتہ دخنزیر و شُربِ خمر جائز ہے تو اس حالت میں سرقہ کا ارتکاب کیوں کر باعثِ قطعِ ید ہو سکتا ہے۔ غور کیجئے تو حضرت عمرؓ کے یہ فیصلے اُن کی شریعتِ اسلام کی ماہرانہ نباضی اور کمالِ قرآن فہمی پر مبنی ہیں نہ کہ حکمِ قرآن سے انحراف و برگشتگی یا اُس کے استخفاف پر!

یہ چند سطور اس لئے لکھی گئی ہیں کہ گذشتہ دو اشاعتوں میں خلفائے راشدین کے عہد میں اجتہاد و تشریع پر جو مقالہ شائع ہوا ہے اُس کی بعض عبارتوں سے قارئین کے ذہن میں کچھ خلجان پیدا ہو گیا ہے، چنانچہ پچھلے دنوں راقم کو متعدد سفر پیش آئے تو ہر جگہ اور ہر محفل میں اس مضمون کا چرچا سنا اور "صدقِ جدید" میں اس پر جو نوٹ شائع ہوا ہے وہ اُس اضطراب کا آئینہ دار ہے جو قارئین میں عام طور پر محسوس کیا گیا، اس موضوع پر معارف اعظم گڈھ میں بھی مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ایک مفید مضمون گذشتہ چند اشاعتوں میں شائع ہو چکا ہے۔

© rasailojaraid.com